نماز سے مقدم ہے (کمارُدی عن ابن عباس) تیسرے یہ کہ اطرافِ عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل (جصاص)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے رہنے

مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ

والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر فرمایا اور جو

كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ

کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ

الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بُری جگہ ہے رہنے کی، اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں خانہ کعبہ کی اور

اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا

اسمٰعیل، دعا کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے بیشک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا اے پروردگار

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص

ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی ہے توبہ قبول کرنیوالا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس (موقع) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (و امان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) اُن کو (کہتا ہوں) جو اُن میں اللہ تعالیٰ

پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دوں گا مومن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر رہے (البتہ نجات آخرت چونکہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے، سو اس واسطے) ایسے شخص کو (جو کہ کافر ہو) تھوڑے روز (یعنی دنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا، لیکن (پھر بعد مرگ) اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچا دوں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بُری ہے (اللہ بچا دے)، اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسمٰعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں (ہماری دعا کو سنتے ہیں ہماری نیتوں کو جانتے ہیں) اے ہمارے پروردگار اور (ہم دونوں یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں، مال و منال اہل و عیال اور خود اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعمیلِ احکام ربانی میں مسارعت کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائب روزگار میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و محبت ایک طبعی اور فطری امر ہونے کے ساتھ حکم ربانی بھی ہے، مذکور الصدر آیات اس کا مظہر ہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دین و دنیا کی آسائش و راحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں دعا کو شروع لفظ رب سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں "اے میرے پالنے والے" ان الفاظ میں دعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور لطف و کرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دواعی ہیں، پھر سب سے پہلی دعا یہ فرمائی کہ اس چٹیل میدان کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لا ڈالا ہے آپ ایک شہر بنا دیں، تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو وحشت نہ ہو اور ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر آجائیں، یہی دعا سورۂ ابراہیم میں هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں البلد کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں معرفہ کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دعا، جو آیت

سورۂ بقرہ میں بَلَدًا کے لفظ آئی ہے یہ اس وقت کی گئی ہے جب یہ جگہ جنگل تھی، شہر بنا نہیں تھا اسوقت بلد کو بغیر الف لام کے نکرہ استعمال کیا اور دوسری دعا بظاہر اسوقت کی ہے جب مکہ کی بستی بس گئی اور وہ شہر معروف بن گیا، اس کا قرینہ یہ ہے کہ سورۂ ابراہیم کی آخری آیات میں ہے، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ وَهَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ ‹‹ (۱۴: ۳۹) جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دعا حضرت اسحٰق کی پیدائش کے بعد کی ہے، اور حضرت اسحٰق حضرت اسمٰعیل سے تیرہ سال بعد میں پیدا ہوئے (ابن کثیر)

دوسری دعا اس میں یہ ہے کہ اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے، یعنی جو قتل و غارت گری سے کفار کے تسلط سے اور آفات سے مامون و محفوظ رہے۔

حضرت خلیل اللہ کی یہ دعا قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہوگیا، کہ اس کی اپنی آبادی کے علاوہ ساری دنیا کا مرجع بن گیا، اطرافِ عالم سے مسلمان وہاں پہنچنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں، اور مامون و محفوظ بھی ہوگیا، کہ بیت اللہ کے مخالف کسی قوم اور کسی بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہو سکا، اصحابِ فیل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انھوں نے بیت اللہ پر حملے کا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

یہ شہر قتل و غارت گری سے بھی برابر محفوظ چلا آیا ہے، اسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت والے کتنی ہی خرابیوں اور کفر و شرک کی رسموں میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحول حرم کی تعظیم و تکریم کو ایسا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے کہ کیسا ہی دشمن وہاں کسی کو مل جائے حرم میں اس سے قصاص یا انتقام نہ لیتے تھے، بلکہ سکانِ حرم کی تعظیم و تکریم بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے مکہ والے ملک شام اور یمن سے تجارتی درآمد و برآمد کا سلسلہ رکھتے تھے اور کوئی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

حدودِ حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں ایسا ہی جانوروں میں بھی یہ قدرتی احساس پیدا فرما دیا ہے، کہ حدودِ حرم میں آکر جانور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبراتا۔

حرم محترم کے مامون ہونے کے یہ احکام جو دعاءِ ابراہیمی کا نتیجہ ہیں زمانۂ جاہلیت سے قائم چلے آتے تھے، اسلام اور قرآن نے ان کو اور زیادہ نکھارا، اور تقویت پہنچائی، حجاج ابن یوسف اور پھر قرامطہ کے ظلم و ستم اور بدکاریوں سے جو قتل و قتال حرم میں ہوا اوّل تو وہ خود اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی کافر قوم حملہ آور نہ تھی، اور کوئی شخص خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو وہ امن کے منافی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعات شاذہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہزاروں سال کی مدت میں گنے چنے ہیں، اور قتل و قتال کے بعد ایسا کرنے والوں کا انجام

بھی سب کے سامنے آگیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعاءِ ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک مامون شہر اور تمام دنیا کے لئے امن کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنا دی ہے، یہاں تک کہ دجال کو بھی حرم میں داخل ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ احکام جاری فرما دیئے کہ حرم میں باہمی قتل و قتال تو کیا جانوروں کا شکار بھی حرام کر دیا گیا۔

تیسری دعاء یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمائیے، مکہ مکرمہ اور اس کے آس پاس کی زمین نہ کسی باغ و چمن کی متحمل تھی، نہ وہاں دُور دُور تک پانی کا نام و نشان تھا، مگر حق تعالیٰ نے دعاءِ ابراہیمی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طائف کا ایک ایسا خطہ بنا دیا جس میں ہر طرح کے بہترین پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ آکر فروخت ہوتے ہیں، بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ طائف دراصل ملک شام کا خطہ تھا جس کو بحکم خداوندی جبرئیل امین نے یہاں منتقل کر دیا۔

حکمتِ ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاء میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو گلزار اور پھلوں کی زمین یا قابلِ کاشت بنا دیجئے، بلکہ دعاء یہ فرمائی کہ یہ چیزیں پیدا کہیں اور ہوں مگر مکہ میں پہنچا کریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت خلیل یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشتکاری یا باغبانی کے کاموں میں مشغول ہو جائے، کیونکہ ان کو اس جگہ آباد کرنے کا منشاء تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود یہ فرما دیا رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام اپنی اولاد کا اصل مشغلہ بیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکھنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ خود مکہ مکرمہ کو ایسا گلزار بنا دیا جاتا کہ دمشق و بیروت اس پر رشک کرتے۔

رزق ثمرات تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے

لفظ ثمرات جو ثمرہ کی جمع ہے اس کے معنی پھل کے ہیں، اور ظاہر اس سے مراد درختوں کے پھل ہیں، لیکن سورہ قصص آیت نمبر ۵۷ میں اس دعاء کی قبولیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے، یُجۡبٰۤی اِلَیۡهِ ثَمَرٰتُ کُلِّ شَیۡءٍ ان الفاظ میں ایک تو اس کی تصریح ہے کہ خود مکہ میں یہ پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں، بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں لائے جایا کریں گے، کیونکہ لفظ یجبیٰ کا یہی مفہوم ہے، دوسرے ثمرات کل شجر نہیں فرمایا، بلکہ ثمرات کل شیٔ فرمایا، اس تغیر لفظی سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں ثمرات کو عام کرنا مقصود ہے، کیونکہ ثمرہ عرف میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیداوار کو کہا جاتا ہے، درختوں سے پیدا ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اسی طرح مشینوں سے حاصل ہونے والا کل سامان بھی مشینوں کے ثمرات ہیں، اسی طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان اُن دستکاریوں کے

ثمرات ہیں، اس طرح ثمرات کل شیءٍ میں تمام ضروریاتِ زندگی داخل ہوجاتی ہیں، اور حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ ارضِ حرم کو نہ کاشت کی زمین بنایا، نہ صنعتکاری کی، لیکن دنیا بھر میں پیدا ہونے والی اور بننے والی چیزیں یہاں عام طور پر مل جاتی ہیں، اور یہ بات شاید آج بھی کسی بڑے سے بڑے تجارتی یا صنعتی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دنیا بھر کی مصنوعات بکثرت و بآسانی وہاں مل جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ کی احتیاط | اس آیت میں جبکہ اہلِ مکہ کے لئے امن اور فراخیِ عیش کی دعا کی گئی، تو ان میں مومن کافر سب داخل تھے، اور اس سے پہلے حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دعا میں اپنی پوری ذریت کو بغیر امتیاز مومن و کافر جمع کیا تھا، تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دعا، مؤمنوں کے حق میں قبول ہے، ظالم مشرکوں کے حق میں قابلِ قبول نہیں، وہ دعا تھی امامت و اقتدار کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو جو مقامِ خلت پر فائز اور خشیۃ اللہ سے لبریز تھے اس جگہ وہ بات یاد آئی تو اپنی دعا میں یہ قید لگادی کہ یہ معاشی خوش حالی اور امن و امان کی دعا صرف مؤمنین کے لئے کرتا ہوں، حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیت و احتیاط کی قدر کی گئی اور فرمایا وَمَنْ کَفَرَ یعنی یہ دنیوی خوش حالی اور اقتصادی فراخی ہم سبھی اہلِ مکہ کو عطا کریں گے، اگرچہ وہ ظالم مشرک کافر ہی ہوں، البتہ مؤمنین کو یہ خوش حالی جس طرح دنیا میں دی جائے گی اسی طرح آخرت میں بھی عطا ہوگی، اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم | رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکمِ ربانی کی تعمیل میں ملکِ شام کے ہرے بھرے خوش منظر خطہ کو چھوڑ کر مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان اپنے اہل و عیال کو لا ڈالا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہدے کرنے والے کے دل میں عجب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو بہت کچھ قابلِ قدر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، رب العزت کی بارگاہِ عزت و جلال کو پہچاننے والے ہیں کہ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان عبادت و اطاعت ممکن نہیں، ہر شخص اپنی قوت و ہمت کی مقدار سے کام کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ الحاح و زاری کے ساتھ دعا کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہوجائے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بناء بیت اللہ کے عمل کے متعلق یہ دعا فرمائی کہ "اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمالیں، کیونکہ آپ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں، ہماری دعا کو سنتے ہیں اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں"

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ، یہ دعا بھی اسی معرفت و خشیت کا نتیجہ ہے جو حضرت خلیلؑ

کو حاصل تھی، کہ اطاعت و فرمانبرداری کے بے مثال کارنامے بجالانے کے بعد بھی یہ دعا کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے" وجہ یہ ہے کہ جتنی کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے، کہ ہم حقِ وفاداری اور حقِ فرمانبرداری پورا ادا نہیں کر رہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا، اس دعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ان کو اپنی اولاد سے کس قدر محبت ہوتی ہے، مگر اس محبت کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں، عوام تو اولاد کی صرف جسمانی صحت و راحت کو جانتے ہیں، اُن کی ساری شفقت و راحت اُسی کے گرد گھومتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جسمانی سے زیادہ رُوحانی اور دُنیوی سے زیادہ اُخروی راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک جماعت کو پورا فرمانبردار بنا دیجئے، اپنی ذریت کے لئے دعا میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہے تو عوام میں اُن کی مقبولیت فطری ہوتی ہے اُنکی صلاحیت صلاحِ عوام کا ذریعہ بنتی ہے (بحر محیط)

حضرت خلیل اللہ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی کہ آپ کی ذریت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو دینِ حق پر قائم اور اللہ کے فرماں بردار بندے تھے، جاہلیتِ عرب میں جبکہ پوری دنیا کو خصوصاً عرب کو شرک و بت پرستی نے گھیر لیا تھا اس وقت اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ کچھ لوگ عقیدۂ توحید و آخرت کے سچے معتقد اور اطاعت شعار رہے ہیں، جیسے اہلِ جاہلیت میں زید بن عمرو بن نُفیل اور قُس بن ساعدہ تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد عبدالمطلب بن ہاشم کے متعلق بھی یہی روایت ہے کہ وہ شرک و بت پرستی سے بیزار تھے (بحر محیط)

أَرِنَا مَنَاسِكَنَا، مناسک منسک کی جمع ہے، اعمالِ حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقاماتِ حج، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہوسکتے ہیں، اور دعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح سمجھا دیجئے، اسی لئے لفظ أَرِنَا استعمال فرمایا جس کے معنی ہیں ہمیں دکھلا دیجئے، وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہوسکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقاماتِ حج کو بذریعہ جبرئیل امینؑ دکھلا کر متعین کردیا گیا اور احکامِ حج کی واضح تلقین و تعلیم فرمادی گئی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو

۱۵ ع ۸ ۱۵ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

خلاصۂ تفسیر اے ہمارے پروردگار اور یہ بھی دعاء ہے کہ اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دعاء اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے کی) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام۔

تشریحِ لغات

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ، مصدر تلاوۃ سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، اصطلاح قرآن و حدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلام الٰہی کے پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں، امام راغب اصفہانیؒ نے "مفردات القرآن" میں فرمایا ہے کہ کلام الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جا سکتا۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، اس میں کتاب سے مراد کتاب اللہ ہے، اور الحکمۃ کا لفظ عربی لغت میں کئی معنے کے لئے آتا ہے، حق بات پر پہونچنا، عدل و انصاف، علم و حلم وغیرہ (قاموس) امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لئے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے لئے جاتے ہیں، ترجمہ شیخ الہندؒ میں اس کا ترجمہ "تہہ کی باتیں" اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے، اور لفظ حکمت عربی زبان میں کئی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، علم صحیح، نیک عمل، عدل و انصاف، قول صادق وغیرہ۔ (قاموس و راغب)

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ حکمت سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہؓ و تابعینؒ جو معانیِ قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام تفسیر ابن کثیرؒ و ابن جریرؒ نے حضرت قتادہؓ سے یہی تفسیر نقل کی ہے کسی نے تفسیرِ قرآن اور کسی نے تفقہ فی الدین فرمایا ہے اور کسی نے علم احکام شرعیہ کہا اور کسی نے کہا کہ ایسے احکام الٰہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی

حدیث و سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

لفظ يُزَكِّيْهِمْ ۔ زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے۔

معارف و مسائل

تشریح مذکورہ سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ نسل کی فلاح دنیا و آخرت کے واسطے حق تعالیٰ سے یہ دعاء کی کہ میری اولاد میں ایک رسول بھیج دیجئے جو ان کو آپکی آیات تلاوت کر کے سنائے اور قرآن و سنّت کی تعلیم دے، اور ان کو ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک کرے، اس میں حضرت خلیل اللہؑ نے اس رسول کے لئے اپنی اولاد میں ہونے کی اس لئے دعاء فرمائی کہ اول تو یہ اپنی اولاد کے لئے سعادت و شرف ہے، دوسرے ان لوگوں کے لئے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول جب انہی کی قوم اور برادری کے اندر ہوگا، تو اس کے چال چلن سیرت و حالات سے یہ لوگ بخوبی واقف ہوں گے، کسی دھوکہ فریب میں مبتلا نہ ہوں گے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دعاء کا جواب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دعاء قبول کر لی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (ابن جریر و ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین اسوقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا، اور میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتداء بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا مظہر ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے، مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱: ۶)، اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملکِ شام کے محلات جگمگا اُٹھے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ سورۂ آل عمران (آیت نمبر ۱۶۴) اور سورۂ جمعہ آیت نمبر ۲ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسولؑ کے بھیجنے کی دعاء فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

بعثتِ رسولؐ کے تین مقاصد سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اور سورۂ آل عمران اور سورۂ جمعہ کی آیات میں آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدۂ نبوت و رسالت کے فرائضِ منصبی تین بیان کئے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔

پہلا مقصد تلاوتِ آیات یہاں پہلی بات قابلِ غور ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ قرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں، اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے، ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر اتنی تعلیم کیلئے کافی تھا کہ الگ سے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت نہ تھی تو پھر تلاوتِ آیات کے ایک علیحدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جداگانہ دوسرا مقصد رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے، اوّل یہ کہ قرآن کریم دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر معمولی تغیر و تبدل بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنے سمجھے ہوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو و فضول ہے، بلکہ قرآن کریم جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظِ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصولِ فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ھو النظم والمعنی جمیعا یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ مضامین بالکل صحیح درست ہی ہوں، ان مضامینِ قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے، تو نماز ادا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام جو قرآن سے متعلق ہیں اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے، وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے امت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے، جس کو عرف میں اردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ درحقیقت جو قرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیم کتاب

سے علیحدہ تلاوتِ آیات کو جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں تو بیکار نہیں، بلکہ موجبِ ثوابِ عظیم ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب تک قرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے، یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آجکل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثوابِ عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو معانی قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے۔ انھوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہوتا، انھوں نے ساری عمر تلاوتِ قرآن کو حرزِ جان بنائے رکھا، بعضے صحابہؓ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، بعض دو دن میں اور اکثر حضرات تین دن میں ختمِ قرآن کے عادی تھے، اور ہر ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کا تو پوری امت کا معمول رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجبِ انوار و برکات اور سرمایۂ سعادت و نجات ہے، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانیِ قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بدنصیبی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ

قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جنتر منتر کی طرح صرف بھاڑ پھونک میں استعمال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورۂ یٰسٓ کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہو کہ اس آیت میں فرائضِ رسولؐ بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب ولہجہ میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقل فرض ہو، اسی طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیم رسولؐ کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم و فنون میں یہ بات معلوم و مشاہد ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں، جب تک کہ اس فن کو کسی ماہر اُستاذ سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آجکل ڈاکٹری، ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں، معمولی روزمرہ کے کام محض کتابی مطالعہ بغیر استاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دیکر کام سکھانے کے طریقے بتائے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار، اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ معمولی فنون اور اُن کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیم استاد کی ضرورت ہے تو مضامینِ قرآن جو علوم الٰہیہ سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک تمام گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہو وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارفِ قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر ادیب ہیں وہ سب سے بڑے مفسرِ قرآن مانے جاتے، اور عہدِ رسالت میں ابوجہل، ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسولؐ کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک

مستقل فرض قرار دیا، دوسری طرف تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلا دیا کہ محض تلاوتِ آیات کا سن لینا فہم قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں، بلکہ تعلیم رسولؐ ہی کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیماتِ رسولؐ سے جدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اگر مضامینِ قرآنی کو بتلانے سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسولؐ کو بھیجنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب کسی دوسری طرح بھی انسانوں تک پہونچائی جا سکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مضامینِ قرآنی کی تعلیم و تفہیم کے لئے دنیا کے دوسرے علوم و فنون سے زیادہ تعلیم استاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر عام استاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا استاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرفِ ہمکلامی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی و رسول کہا جاتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کریم کے معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، ارشاد ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴) "یعنی ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں" تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی رکھی گئی ہے، اور میں نے اوپر بتلایا ہے کہ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں صحابہؓ و تابعینؒ نے حکمت کی تفسیر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، جس سے واضح ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ جس طرح معانی قرآن کا سمجھانا و بتلانا فرض ہے، اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اصول و آداب جن کا نام سنت ہے، ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اور یہ ظاہر ہو کہ جب آپ کا مقصد وجود معلم ہونا ہے، تو آپ کی امت کا مقصد وجود متعلم اور طالب علم ہونا لازم ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہیے جس کو تعلیماتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو، اگر علوم قرآن و سنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت و فرصت نہیں ہے تو کم از کم بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہیے۔

تیسرا فرض تزکیہ تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تزکیہ ہے، جس کے معنی ہیں، ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا، ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقاد فاسد، نیز تکبر و حسد، بغض، حب دنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علی طور پر قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آ گیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا

جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری و علمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے، سلوک و تصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے اُن کی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت و اصلاح کے دو سلسلے، کتاب اللہ اور رجال اللہ

اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابل نظر ہیں:

اوّل یہ کہ اللہ جل شانہٗ نے ابتداءِ آفرینش سے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں، ایک آسمانی کتابوں کا دوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا، جس طرح محض کتاب نازل فرما دینے کو کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کے بھیجنے پر بھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے، اللہ جل شانہٗ کی اس عادت اور قرآن کریم کی شہادت نے قوموں کی صلاح و فلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرما کر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے، نہ کوئی مربی انسان، بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات اور الٰہی قانون کی ضرورت ہے جس کا نام کتاب یا قرآن ہے، دوسری طرف ایک معلم اور مربی انسان کی ضرورت ہے جو اپنی تعلیم و تربیت سے عام انسان کو آسمانی ہدایات سے روشناس کر کے ان کا خوگر بنائے، کیونکہ انسان کا اصلی معلم انسان ہی ہو سکتا ہے، کتاب معلم یا مربی نہیں ہو سکتی، ہاں تعلیم و تربیت میں معین و مددگار ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتداء ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دنیا میں پیدا کر دیا، اسی طرح آگے آنیوالی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعت مطہرہ اور دوسری طرف رجال اللہ کا سلسلہ رہا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۹: ۱۱۹)	"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو"

دوسری جگہ صادقین کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲: ۱۷۷)	"اور یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی ہیں پرہیزگار"

پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ صراط مستقیم کی ہدایت ہے

یہاں بھی صراط مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراط القرآن یا صراط الرسول یا صراط السنۃ فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ اُن سے صراطِ مستقیم حاصل کی جائے، ارشاد ہوا:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝	"یعنی صراطِ مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے نہ کہ اُن لوگوں کا جو گمراہ ہو گئے۔"

دوسری جگہ ان کی مزید تعیین اور توضیح قرآن میں وارد ہوئی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ (۴: ۶۹)

اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کر کے دینی معاملات میں آپ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی، ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِىْ اَهْلَ بَيْتِىْ (ترمذی)	"اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہنا تو تم گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ دوسری میری اولاد اور اہل بیت"

اور صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

اِقْتَدُوْا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِىْ اَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ	"یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اتباع کرو"

اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ	"میرے طریقہ کو اختیار کرو، اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ قوموں کی اصلاح و تربیت کے لئے ہر قرن ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں، قرآنی ہدایات اور ان کے سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرین شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم و تربیت، اور اگر مختلف علوم و فنون اور اُن کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ اصول تعلیم و تربیت کچھ دین اور دینیات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم و فنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دوسری طرف ماہرین کی تعلیم و تربیت، ہر علم و فن کی ترقی و تکمیل کے یہی دو بازو ہیں، لیکن دین اور دینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اٹھانے

میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کی غلط روش میں پڑ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اٹھانے کے نقصان اور بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علماء و مشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں اور ان کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۱:۹) "یعنی ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنا لیا"۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر کا ہے، اور لاکھوں انسان اس راستہ میں برباد ہوئے، اور ہو رہے ہیں، اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علوم قرآن و حدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلّم و مربّی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علماء کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت۔ یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دین و ملت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار ہونا ہے، کیوں کہ ماہرین کی امداد و اعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملت سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے، اور اطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسولؐ بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہے، رسولؐ کی اطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے، کہ وہ بعینہٖ اللہ جل شانہٗ کی اطاعت ہے، ہاں اس کے ساتھ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں اور ان کے احکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول و فعل سے امداد لینے کو سرمایۂ سعادت و نجات سمجھنا ضروری ہے، آیت مذکورہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب کو داخل فرمانے سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیم رسولؐ ضروری ہوا اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہو تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیر و زبر محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیمات رسولؐ بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں، ورنہ محض الفاظ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزول قرآن کا اصلی مقصد پورا نہ ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کو سنت یا حدیث رسولؐ کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کے لئے موعود ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝	ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ۝

جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور زیر زبر تک بالکل محفوظ چلے آتے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیت مذکورہ کی رُو سے لازمی ہے، اور بحمداللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں، جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی ماہرین سنت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ بکھار کر رکھ دیا، اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں قیامت تک ایسی جماعت اہل حق اور اہل علم قائم رہے گی، جو قرآن و حدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی، اور اُن میں ڈالے گئے ہر رخنہ کی اصلاح کرتی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیم رسولؐ ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیمات رسولؐ بھی باقی اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشینگوئی موجود ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ سے لے کر آج تک علم حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعہ محفوظ رکھا ہے، اس سے اس دجل و الحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آجکل بعض لوگوں نے احکام اسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرۂ حدیث محفوظ اور قابل اطمینان نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ذخیرۂ حدیث سے اعتماد اُٹھ جائے تو قرآن پر بھی اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی تزکیہ قرار دیا ہے، تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائد فاسدہ سے نیز بُری اخلاق بکبر، حرص و طمع، بغض و حسد، حُبِّ مال و جاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اصلاح انسان کیلئے صرف تعلیم صحیح بھی کافی نہیں اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصد رسالت اور رسولؐ کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاح اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربّی کے زیر نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلا دینا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت کی صحبت

اور اطاعت کے اور کچھ نہیں، ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصدِ رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیماتِ اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے، کیونکہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت میں کسی نہ کسی صورت سے کامل یا ناقص طریق پر ضروری سمجھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لیکر عائلی پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیۂ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے، اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیرِ تعلیم رہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا، اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کی زیرِ تربیت تیار ہوئی، ایک طرف اُن کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہو گئے، تو دوسری طرف ان کے تزکیۂ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (۲۹:۴۸)

"اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں، تم انہیں کبھی سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں"

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے فتح و نصرت اُن کے قدم لیتی تھی، تائید ربانی ان کے ساتھ ہوتی تھی، اُن کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں کو مرعوب کئے ہوئے

ہیں وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں، آج دنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیلی و ترمیم پر تو سب لوگ غور کرتے ہیں، لیکن تعلیم کی رُوح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی، کہ مدرّس اور معلّم کی اخلاقی حالت اور مصلحانہ تربیت کو دیکھا جائے اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دوسروں پر اثر انداز ہوں، اور دوسروں کی تربیت کر سکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہوں گے ان سے پڑھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ انہی جیسے پیدا ہو سکیں گے، اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے تین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ سردارِ دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تین منصبی سپرد کئے گئے تھے، ان کو آپ نے کس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے، کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوتِ آیات کا یہ درجہ ہو گیا تھا، کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن پڑھا جا رہا تھا ہزاروں اس کے حافظ تھے، سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے، تعلیم کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا ؎

بتیے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

دنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توریت و انجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے، قرآنی اصول کو عزت و شرف کا معیار مانا جاتا تھا، تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بداخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیبِ اخلاق کے معلّم بن گئے، بداخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحتیاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، غرض بت پرست لوگ ایثار و ہمدردی کے مجسمے بن گئے، تند خوئی اور جنگ جوئی کی جگہ نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی، چور اور ڈاکو لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جن مقاصد کے لئے دعا فرمائی، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تینوں مقصد آپ کے عہدِ مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ نے تو ان کو مشرق سے مغرب

اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں عام کردیا، فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین وسلم تسلیماً کثیرًا لعدد من صلّٰی وصام وقعد وقام ۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بیشک

اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں ،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى

یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکمبرداری کر تو بولا کہ میں حکمبردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا، اور یہی وصیت

بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ

کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بیشک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو

الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ۔

حل لغات

سَفِهَ نَفْسَهٗ ۔ سفہ بمعنی جہل، وانتصاب نفسہ علیٰ انہ تمیز علیٰ قول الفراء اوشبیہ بالمفعول علیٰ قول بعض الکوفیین اومفعول بہ اما لکون سفہ متعدیًا بنفسہ کسَفَّہ المضعف اولکونہ ضمن معنی ما یتعدی ای جہل وھو قول الزجاج ، ترجمہ شیخ الہندؒ اسی پر مبنی ہے اسلئے سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی پہلی توجیہ کے اعتبار سے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے کہ اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور دوسری توجیہ پر معنی یہ ہوں گے کہ ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی وہی کریگا جو اپنے نفس سے بھی جاہل ہو، یعنی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ میں کیا ہوں ۔

خلاصۂ تفسیر

اور ملتِ ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو (عہدۂ رسالت کے لئے) دنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے، اور یہ انتخاب عہدۂ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو، انھوں نے عرض کیا کہ میں نے

اطاعت اختیار کی رب العالمین کی (پس اسی اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے اُن کو شرفِ نبوت دیدیا، خواہ اسی وقت ہو یا بعد چندے) اور اسی (ملتِ موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب علیہ السلام بھی (اپنے بیٹوں کو جس کا یہ مضمون تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام واطاعتِ حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم (دم مرگ تک اسی کو مت چھوڑنا اور) بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا ۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان سے انحراف کی خرابی کا بیان ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباعِ ملتِ ابراہیمی کے متعلق دعوؤں کی تردید اور صرف ملتِ اسلام کا ملتِ ابراہیمی کے مطابق ہونا اور دینِ اسلام کی حقیقت اور یہ کہ وہ تمام انبیاء کا مشترکہ دین ہے، ذکر کیا گیا ہے ۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام مذکور ہے، پہلی آیت میں ملتِ ابراہیمی کی فضیلت اور اسی کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلا کر ان کی ملت سے انحراف کرنے کو احمقانہ کام بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے، وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو کیونکہ یہ ملت عین دینِ فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا، آگے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اسی ملت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی، دنیا کی عزت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دنیا نے کرلیا، کہ نمرود جیسا صاحبِ اقتدار بادشاہ اور اس کی قوم اس اکیلے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی، اور اپنے اقتدار کے سارے عوامل ان کے خلاف استعمال کرلئے، آخر میں آگ کے ایک بڑے انبار میں اُن کو ڈال دیا گیا، مگر دنیا کے سارے عناصر اور ان کی طاقتیں جس قدرت والے کے تابع فرمان ہیں اس نے سارے نمرودی منصوبوں کو خاک میں ملادیا، آگ ہی کو اپنے خلیلؑ کے لئے گلزار بنادیا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئیں، دنیا کے سارے مومن اور کافر یہاں تک کہ بُت پرست بھی اس بُت شکن کی عزت کرتے چلے آئے، مشرکینِ عرب بہرحال اولادِ ابراہیمؑ تھے، بُت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی عزت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملتِ ابراہیمی کے مٹے مٹے کچھ آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج و عمرہ و قربانی، مہمان نوازی انہی کے باقیات صالحات تھے، اگرچہ جہالت نے اُن کو بھی مسخ کر دیا تھا، اور یہ نتیجہ اس خداوندی انعام کا ہے جس کی رُو سے خلیل اللہؑ کو امام الناس کا خطاب دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

ابراہیم اور ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اس قدر غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونا بھی دنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل و فہم تھی وہ اس ملت کے سامنے جھک گیا تھا۔

یہ تو ابراہیم علیہ السلام کے دنیاوی شرف و بزرگی کا ذکر تھا، آخرت کا معاملہ جو ابھی سامنے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عزت و فضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجاتِ عالیہ معتبر رہیں۔

ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اسلام، یعنی اطاعتِ حق ہے وہ صرف اسلام میں منحصر ہے

اس کے بعد دوسری آیت میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول بتلائے گئے، ارشاد ہوا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، "یعنی جب فرمایا ابراہیمؑ سے اُن کے رب نے کہ اطاعت اختیار کرو تو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی"۔ اس طرزِ بیان میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے خطاب اَسْلِمْ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ اَسْلَمْتُ لَكَ، یعنی میں نے آپکی اطاعت اختیار کرلی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی میں نے پروردگارِ عالم کی اطاعت اختیار کرلی، ایک تو اس میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق جل و علا شانہٗ کی حمد و ثناء شامل ہوگئی جس کا مقام تھا، دوسرے اس کا اظہار ہوگیا کہ میں نے جو طاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا، کیونکہ وہ رب العالمین یعنی سارے جہان کا پروردگار ہے، سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، جس نے اطاعت اختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ اسلام میں منحصر ہے، جس کے معنی ہیں اطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم علیہ السلام کے مذہب و مسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ

خلیل اپنے مقامِ عالی تک پہنچا ہے، اور اسلام یعنی اطاعتِ حق ہی وہ چیز ہے جس کے لئے یہ سارا جہان بنایا گیا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اور نقطۂ وحدت ہے، حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو چلایا، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:

۱۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳:۱۹)	"دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"
۲۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔ (۳:۸۵)	"اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین و مذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں ہے"

اور ظاہر ہے کہ جتنے دین و مذہب مختلف انبیاء علیہم السلام لائے ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دین اسلام ہی ہوں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دین موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کہا جائے یا یہودیت و نصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل اطاعتِ حق ہے، البتہ اس میں ایک خصوصیت ملتِ ابراہیمی کو حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام بھی اسلام تجویز کیا اور اپنی امت کو بھی اُمتِ مسلمہ کا نام دیا، دعاء میں عرض کیا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲:۱۲۸)	"اے ہمارے پروردگار بنا دیجئے ہم دونوں (ابراہیم و اسمٰعیل) کو مسلم (یعنی اپنا فرمانبردار) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا"

اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲:۱۳۲)	"تم بجز مسلم ہونے کے کسی مذہب پر جان نہ دینا"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امتیاز حضرت ابراہیمؑ ہی کی تجویز کے مطابق امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو حاصل ہوا، کہ اس کا نام امتِ مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملتِ اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲:۷۸)	"تم اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی اور اس (کتاب) میں بھی (یعنی قرآن میں)"

کہنے کو تو یہود بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمؑ پر ہیں، نصاریٰ بھی اور مشرکینِ عرب بھی

لیکن یہ سب غلط فہمی یا جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں ملتِ محمدیہ ہی آخری دور میں ملتِ ابراہیمی اور دینِ فطرت کے مطابق تھی۔

خلاصۂ کلام یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور جتنی کتابیں اور شرائع نازل ہوئے ان سب کی رُوح اسلام یعنی اطاعتِ حق ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں فرمانِ حق کی اطاعت اور اتباعِ ہوٰی کو چھوڑ کر اتباعِ ہدیٰ کی پابندی۔

افسوس ہے کہ آج اسلام کا نام لینے والے لاکھوں مسلمان بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہو گئے اور دین و مذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انھیں قرآن و حدیث کی صرف وہ تفسیر و تعبیر بھلی معلوم ہوتی ہے جو اُن کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جامۂ شریعت کو کھینچ تان کر بلکہ چیر پھاڑ کر اپنی اغراض اور اہواءِ نفسانی کے بتوں کا لباس بنا دیں کہ دیکھنے میں دین و مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباعِ ہوٰی اور خواہشات کی پیروی ہے ؎

سودہ شد از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

غافل انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ حیلے اور تاویلیں مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، مگر خالق کے سامنے جس کا علم ذرہ ذرہ کو محیط ہے، جو دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں بھیدوں کو دیکھتا اور جانتا ہے اس کے آگے بجز خالص اطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں ؎

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہو کر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ حضرت حق جل شانہٗ کی رضا کس کام میں ہے، اور اس کا فرمان میرے لئے کیا ہے، وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گوش برآواز رہے، کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے، اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک راضی ہو، اسی کا نام عبادت و بندگی ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست
ہشدار و گوش را بہ پیامِ سروش دار

اسی جذبۂ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے، جس کو مقامِ عبدیت

کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا خطاب پاتے ہیں، اور سید الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عَبْدُنَا کا خطاب ملتا ہے، اسی عبدیت اور اطاعت کے ذیلی درجات پر امت کے اولیاء، اقطاب و ابدال کے درجات دائر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی توحید ہے جس کے حاصل ہونے پر انسان کے خوف و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں ؎

امید و ہراسش نباشد ز کس
ہمین ست بنیادِ توحید و بس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعتِ حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے، جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۴: ۶۵)

تیرے رب کی قسم وہ کبھی مومن نہ ہوں گے جب تک وہ آپ کو اپنے تمام اختلافی معاملات میں حکم تسلیم نہ کرلیں اور پھر آپ کے فیصلہ کو کوئی دل تنگی محسوس نہ کریں، اور فیصلہ کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہ کریں۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی، اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی حالت اور کسی ملت پر نہ مرنا، مراد اس کی یہ ہو کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام ہی پر فرما دے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پابند رہو گے، اسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں محشر میں قائم ہو گے، اللہ جل شانہٗ کی عادت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیدیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے کام اور اہل جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فیصلہ رہ جاتا ہے، مگر پھر اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اہل دوزخ کے سے کام کرنے لگتا ہے، اور انجام کار دوزخ میں جاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی ہے اور آخر عمر میں اہلِ جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ فیما یبدو للناس یعنی جس نے عمر بھر جنت کے کام کئے اور آخر میں دوزخ کے کام میں لگا درحقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہل جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، درحقیقت وہ اوّل ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر نظر میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی نیک کام میں مشغول رہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور عادت کی بنا پر یہی امید رکھنا چاہئے کہ اس کا خاتمہ بھی نیکی پر ہوگا۔

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۙ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ

کس کی عبادت کروگے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں

إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ وَنَحْنُ لَهُ

کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے

مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم

فرمانبردار ہیں، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اُن کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمھارے

مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

واسطے ہی جو تم نے کیا اور تم سے پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

خلاصۂ تفسیر

کیا (تم لوگ کسی معتبر صحیح نقل سے دعویٰ مذکورہ کرتے ہو یا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدہ کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کروگے، انھوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذات پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ، (حضرات) ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، (یعنی وہی) معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور ہم (احکام میں) اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے، یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر

چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمھارے کام تمھارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، رہا اس سے تم کو نفع پہنچانا یہ تو بڑی دور ہے)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملّتِ ابراہیمؑ اور اسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیات مذکورہ میں ایک اور اصولی بات قابلِ نظر ہے کہ ملّتِ ابراہیمؑ کہئے یا اسلام یہ پوری قوم بلکہ ساری دنیا کے لئے ہدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولاد ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہوئی کہ آیات مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنی اولاد کو بطور وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقامِ رسالت و نبوت بلکہ مقامِ خلّت کے بھی منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رب کا اشارہ پاکر اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے، وہی دوسرے وقت اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی آسائش اور بھلائی کے لئے اپنے رب سے دعائیں بھی کرتا ہے، دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہے، یعنی اسلام

آیت مذکورہ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ کا یہی مطلب ہے، اور آیت اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ کا یہی حاصل ہے، فرق اتنا ہے کہ عام انسانوں کی نظروں میں نعمت و دولت دنیا کی فانی اور ذلیل چیزیں ہیں، ان کی نظر اور حوصلہ بلند ہے، ان کے نزدیک اصلی دولت ایمان اور عمل صالح یا اسلام ہے۔

جس طرح عام انسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتے ہیں کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی آجکل یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولادوں اور فیکٹریوں کی مالک ہو، ان کو امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے لائسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہو، یا ایک سروس والا انسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو اونچے عہدے اور بڑی تنخواہیں ملیں یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اسکی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے گُر بتلادے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولیاء کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصلی اور دائمی لازوال دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اور کوششیں بھی آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ

آیاتِ مذکورہ سے واضح ہے۔

اولاد کے لئے کوئی دولت دین واخلاق سکھانے کے برابر نہیں

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ خاص میں عام انسانوں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ جس طرح ان کی دنیوی پرورش اور ان کے دنیوی آرام وراحت کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظری، عملی اور اخلاقی تربیت کریں، بُری راستوں اور بُرے اعمال واخلاق سے ان کو بچانے میں سعی بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور اصل خیرخواہی یہی ہے، یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے تو ساری توانائی خرچ کرے اور دائمی آگ سے اور عذاب سے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے بدن سے پھانس نکالنے میں تو سارے ذرائع اور وسائل استعمال کرے، اور بندوق کی گولی کا نشانہ بننے سے اس کو نہ بچائے۔

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ عمل سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح وفلاح کی فکر کی جائے ان کے بعد دوسروں کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو حکمتیں ہیں:

اوّل یہ کہ طبعی اور جسمی تعلق کی بناء پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے قبول کرسکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک اور اصلاحی کوشش میں اُن کے دست وبازو بن کر اشاعتِ حق میں اُن کے معین ہوں گے۔

دوسرے اشاعتِ حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا ذمہ دار آدمی اپنے اہل وعیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دل وجان سے لگ جائے کہ اس طرح تبلیغ وتعلیم اور اصلاح وتربیت کا دائرہ عمل سمٹ کر صرف گھروں کے ذمہ داروں تک آجاتا ہے، ان کو سکھلانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معنی ہوجاتا ہے، قرآن کریم نے اسی تنظیمی اصول کے پیشِ نظر ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (۶۶:۶)	"اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو بڑی آگ سے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کے رسول ہیں، اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے آپ کو بھی سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ (۲۶:۲۱۴)	"اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے۔"

اور ارشاد ہوا۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۲۰:۱۳۲)	"یعنی اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کی تعمیل فرمائی۔

ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک کسی شخص کے اہل وعیال اور قریبی خاندان اس کے نظریات اور عملی پروگرام میں اس کا ساتھی اور ہم رنگ نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم وتبلیغ دوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے جواب میں ابتداءِ اسلام کے وقت عام لوگوں کا یہ جواب ہوتا تھا کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپ درست کرلیں، پھر ہماری خبر لیں، اور جب خاندان میں اسلام پھیل گیا اور فتح مکہ کے وقت اس کی تکمیل ہوئی تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوا کہ:

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱۱۰:۲)	"یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج ہو کر داخل ہوں گے۔"

آجکل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دیندار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دیندار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں اسی کے لئے انتظامات کرتے رہتے ہیں، دولتِ لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمادیں، کہ آخرت کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عملِ صالح کو سمجھ کر اس کی کوشش کریں۔

بعض مسائل متعلقہ

مسئلہ توریث العبد

اس آیت میں حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی طرف سے جو جواب نقل کیا گیا ہے اس میں اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ فرما کر اس طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ دادا بھی باپ ہی کہلاتا ہے، اور باپ ہی کے حکم میں ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ میراث میں دادا کا بھی وہی حکم ہے جو باپ کا ہے۔

آباء واجداد کے اعمال کی جزا سزا اولاد پر نہیں ہوگی

فَلَهَا مَا كَسَبَتْ الآیۃ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے کافی نہیں ہوں گے، جب تک وہ خود اپنے اعمال کو درست نہ کریں، اسی طرح باپ دادا کے بُرے اعمال کا عذاب بھی اولاد پر نہ پڑے گا جب کہ یہ اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بلوغ سے پہلے مرجائے اُن کو اپنے ماں باپ کے کفر وشرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم

جو چاہیں عمل کرتے رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء واجداد کے اعمال سے ہو جائے گی، اسی طرح آجکل کے بعض سید خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولادِ رسولؐ ہیں ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہیں ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے، وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶: ۱۶۴) وغیرہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے بنی ہاشم! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لیکر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو اور صرف میرے نسب کا بھروسہ لیکر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا"

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔	"یعنی جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے ڈالا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا"

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا أَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرٰهٖمَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پاؤ گے راہ راست کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار

حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْنَا

کی راہ ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنیوالوں میں، تم کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر

وَمَآ أُنْزِلَ إِلٰٓى إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ

اور جو اترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا

أُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ أُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے

أَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اُن سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں

۱۵ ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہے ۱۲

۱۵ کسی کا بوجھ قیامت کے روز کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکے گا ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا) یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہِ (حق) پر پڑ جاؤ گے، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے، جس میں کبھی کا نام نہیں، (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے، جس میں علاوہ محرّف ہونے کے اس کے منسوخ ہو چکنے کے سبب اب اس میں کبھی آ گئی) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے، (مسلمانو! یہود و نصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں ان) کی طرف (بواسطہ وحی کے) بھیجا گیا، اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انھوں نے ہم کو یہ دین بتلایا) ہم نے اختیار کر لیا (پس یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر ہم قائم ہیں، جس میں کسی کو اصلاً انکار و سرتابی کی گنجائش نہیں)۔

معارف و مسائل

اولادِ یعقوب علیہ السلام کو قرآن کریم نے لفظ اسباط سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جمع ہے سبط کی جس کے معنی قبیلہ اور جماعت کے ہیں، ان کو سبط کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے صلبی لڑکے بارہ تھے، پھر ہر لڑکے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد ہزاروں افراد پر مشتمل قبیلے تھے، اور دوسری برکت اولادِ یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دس انبیاء کے علاوہ باقی سب انبیاء و رسل ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نوحؑ، شیثؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اسمٰعیلؑ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

سو اگر وہ بھی ایمان لادیں جس طرح پر تم ایمان لائے تو ہدایت پائی انھوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر

هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

وہی ہیں ضد پر، سو اب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے قبول کرلیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

اللغات والبلاغۃ اَلشِّقَاقُ قال البیضاوی ھو المناواۃ والمخالفۃ فان کل واحد من المتخالفین فی شق غیر شق الآخر، اَلصِّبْغَةُ بالکسر فعلۃ من صبغ وھی الحالۃ التی یقع علیھا الصبغ۔

خلاصۂ تفسیر (یعنی جب اوپر طریق اسلام میں دین حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہ (حق) پر لگ جاویں گے، اور اگر وہ (اس سے) روگردانی کریں تو (تم ان کی روگردانی سے کچھ تعجب نہ کرو کیونکہ) وہ لوگ تو ہمیشہ سے) برسر مخالفت ہیں ہی (اور اگر انکی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمھاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمھارے اور ان کے برتاوے) جانتے ہیں، (تمھارے فکر و غم کی کوئی ضرورت نہیں)

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ) ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ و ریشہ میں بھر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب اور کوئی دوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

معارف و مسائل

ایمان کی مختصر اور جامع تفسیر فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ، شروع سورۂ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل کہیں مفصل بیان کیگئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات

پر حاوی ہے، کیونکہ اٰمَنْتُمْ کے مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہیں، اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اختیار فرمایا، جو اعتقاد اس سے سرمو مختلف ہو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہو، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے، اور انبیاء و رسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق جو ایمان و اعتقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے، فرشتوں اور انبیاء و رسل کے لئے جو مقام آپ کے قول و عمل سے واضح ہوا اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہو گیا جو ایمان کے دعویدار ہیں مگر حقیقت ایمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعوٰی ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود و نصاریٰ بھی، اور ہر زمانے میں زندیق و ملحد بھی، مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوا۔

فرشتہ اور رسول کی عظمت و محبت میں اعتدال مطلوب ہے، غلو گمراہی ہے مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا انکار کیا، بعض نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا دیا، دونوں کی تردید بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ سے ہو گئی، یہود و نصاریٰ کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہانتک کہ بعض کو قتل بھی کر دیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزت و عظمت کو اتنا بڑھایا کہ خدا، یا خدا کا بیٹا یا خدا کا مثل بنا دیا، یہ دونوں قسم کی افراط و تفریط ضلالت و گمراہی قرار دی گئی۔

شریعت اسلام میں رسول کی عظمت و محبت فرض ہے، اس کے بغیر ایمان ہی نہیں ہوتا مگر رسول کو کسی صفت علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا گمراہی اور شرک ہے، قرآن کریم نے شرک کی حقیقت یہی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں، اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶ : ۹۸) کا یہی مفہوم ہے، آج بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود و حاضر و ناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اور عمر بھر کی

کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں، اس آیت میں اُن کے لئے بھی سبق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے جیسی صحابہ کرامؓ کے دل میں آپؐ کی تھی، اس سے کمی بھی جرم ہے اور اس میں زیادتی بھی غلو اور گمراہی ہے۔

نبی و رسول کی اختراعی قسمیں: ظلّی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہیں

اسی طرح جن فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت کا انکار کرکے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا، اور قرآن کریم کی واضح تصریح خاتم النبیین کو اپنے مقصد میں حائل پایا تو انھوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اختراع کرلیں، جن کا نام نبی ظلّی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی، مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ایمان بالرسل میں کسی ظلّی و بروزی کا کہیں نام و نشان نہیں، یہ کھلا ہوا زندقہ اور الحاد ہے۔

ایمان بالآخرۃ کی تاویلات باطلہ مردود ہیں

اسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دماغ صرف مادّے اور مادیات میں کھو کر ہوتے ہیں، عالم غیب اور عالم آخرت کی چیزیں جب انھیں مستبعد نظر آتی ہیں تو طرح طرح کی تاویلیں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو اقرب الی الفہم کر دیا، مگر چونکہ وہ تاویلیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے خلاف ہیں، اس لئے سب مردود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ہیں اُن پر بغیر کسی جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے، حشرِ اجساد کے بجائے حشرِ روحانی اور عذاب و ثواب جسمانی کو روحانی اسی طرح وزنِ اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود، باطل اور گمراہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ، میں واضح فرما دیا، کہ آپؐ اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ فرمادیں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری ایک آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ٦۷) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرما دیا، کہ آپؐ مخالفین کی فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان سے آپؐ کی حفاظت خود کریں گے۔

دین و ایمان ایک گہرا رنگ ہے، جو انسان کے چہرہ بشرے سے نظر آنا چاہئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ، اس سے پہلی آیت میں دینِ اسلام کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا، اس جگہ اس کو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے بتلا دیا کہ دین درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی پیغمبر کی طرف اس کی نسبت مجازی کر دی جاتی ہے، اور اس جگہ ملّت کو صِبغت کے لفظ سے تعبیر کرکے دو باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا، اوّل تو نصاریٰ کی ایک رسم کی تردید ہوگئی، ان کی عادت یہ

تھی کہ جو بچہ پیدا ہوا اس کو ساتویں روز ایک رنگین پانی میں نہلاتے تھے، اور بجائے ختنہ کے اسی نہلانے کو بچہ کی طہارت اور دینِ نصرانیت کا پختہ رنگ سمجھتے تھے، اس آیت نے بتلایا کہ یہ پانی کا رنگ تو دُھل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا، نیز ختنہ نہ کرنے کی وجہ سے جو گندگی اور ناپاکی جسم میں رہتی ہے اس سے بھی یہ رنگ نجات نہیں دیتا، اصل رنگ دین و ایمان کا رنگ ہے جو ظاہری اور باطنی پاکی کی ضمانت بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔

دوسرے دین و ایمان کو رنگ فرما کر اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے محسوس ہوتا ہے مومن کے ایمان کی علامات اس کے چہرہ بشرہ اور تمام حرکات و سکنات، معاملات، عادات میں ظاہر ہونا چاہئیں۔ واللہ اعلم۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

کہدے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں، کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ

اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی،

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ

کہدے کہ تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی

مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ

اس کو اللہ کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی،

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

ان کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں اُن کے

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

کاموں کی۔

ع ١٦

خلاصۂ تفسیر آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب (اور مالک) ہے (اور بوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں جیسا تمہارے بعض دعووں سے اختصاص مفہوم ہوتا ہے، مثل نحن ابناء اللہ) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مسلّم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے طریقہ موجودہ کے کہ علاوہ منسوخ ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوط ہے جیسا ان کے اقوال عزیر ابن اللہ اور مسیح ابن اللہ سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی) یا (اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو انبیاء گذرے ہیں یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے (اور اس سے بواسطہ موافقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایک اتنی مختصر سی بات ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاءؑ کا ملتِ اسلام پر ہونا ثابت کر چکے ہیں، جیسا ابھی اوپر گذر چکا ہے اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس من جانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بیخبر نہیں ہیں، (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم طریق دین میں ان کے موافق کب ہوئے پھر تمہارا حق پر ہونا ثابت نہ ہوا) یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو درکنار)

معارف و مسائل

اخلاص کی حقیقت وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ، اس میں امتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے خالص ہے، اخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیرؓ نے یہ بتلائے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو

عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ

ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب،

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۴۲

چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

خلاصۂ تفسیر (جب کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہو کر یہود کا قبلہ متروک ہو گیا تو بوجہ ناگواری کے) (یہ) بیوقوف لوگ ضرور (یہی) کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیں، کسی کو منصب علت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام شرعیہ کے باب میں یہی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، خواہ مخواہ علتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض دربارۂ تحویلِ قبلہ نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سُن لیجئے، جس سے سوال و جواب کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

قبلہ کے لغوی معنی ہیں سمتِ توجہ، یعنی جس طرف رُخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رُخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا اثر طبعی خاص طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رُخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کر لیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کسی